جمعۃ الوداع کو جمعۃ الوصال بنا دیں

رسول کریم ﷺ کے وسیلہ ہونے کی حقیقت

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۰ / اپریل ۱۹۹۰ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے فرمایا:

آج آخر وہ جمعہ کا دن آ گیا جس کی امت محمدؐیہ کو ہر سال بشدت انتظار رہتی ہے۔ یا انتظار کو اگر مذکر لیا جائے تو جس کا امت محمدیہ کو ہر سال شدت سے انتظار رہتا ہے۔ یہ انتظار بعض لوگوں کی صورتوں میں تو سال بھر یہ پھیلا ہوا ہے اور بعض لوگوں کی صورتوں میں ایک مہینے پر پھیلا ہوا ہے یعنی رمضان میں شروع ہوتا ہے اور رمضان میں ختم ہو جاتا ہے اور بعض صرف ایک دن کو نقطے کی طرح اپنی نگاہ کے سامنے رکھتے ہوئے اس کا انتظار کرتے ہیں۔ ان کے انتظار کا سالوں یا مہینوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس جمعہ کو جمعۃ الوداع اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ رمضان کا آخری جمعہ ہے اور اس کے بعد پھر اس سے جدائی ہے۔

میں نے گزشتہ سال بھی اس مضمون پر روشنی ڈالی تھی کہ ہمارے نزدیک تو درحقیقت یہ جمعۃ الوصال ہے کیونکہ یہ جمعہ اگر کوئی اہمیت رکھتا ہے تو سوائے اس کے اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ یہ وہ مبارک دن ہے جس میں وصل الٰہی کا سب سے زیادہ امکان ہے۔ اور وصل کے بعد وداع کا تصور تو بہت بڑا دردناک تصور ہے۔ یہ تو ساری خوشیوں کو المیہ میں تبدیل کر دینے والا تصور ہے۔ پس اگر جمعۃ الوداع کا یہ معنی ہے کہ الحمد للہ کہ یہ جمعہ آیا اور آ کر چلا گیا پس اسے رخصت کرو اور جس طرح

یہاں رواج ہے اسے ٹا۔ٹا کہہ کے اس جمعہ سے چھٹی حاصل کرلو۔ تو یہ ایک بالکل غیر اسلامی، غیر مومنانہ بلکہ ایسا تصور ہے جسے کوئی عاشق قبول نہیں کرسکتا۔ پس یہ جمعہ درحقیقت جمعۃ الوصال کی حیثیت سے ہی اہمیت رکھتا ہے اور جمعہ الوصال کی حیثیت سے ہی اسے سمجھنا چاہئے۔

آنحضرت ﷺ تو درحقیقت رمضان مبارک کے آخری عشرے میں غیر معمولی عبادت کیا کرتے تھے اور اسی عشرے میں لیلۃ القدر کی تلاش فرمایا کرتے تھے اور اس عشرے میں واقعہ ہونے والے جمعہ کو باقی دنوں سے ایک امتیازی شان حاصل ہوتی ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا اور اسی لئے اس جمعہ نے امت محمدیہؐ کے تصورات میں ایک مقام پیدا کیا ہے لیکن اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے متعلق میں قدرے روشنی ڈالوں گا لیکن اس سے پہلے میں اس مضمون کو ایک اور طریق پر شروع کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لقاء ہی کا مضمون ہے جو گزشتہ چند خطبات سے جب سے رمضان کے خطبے شروع ہوئے ہیں جاری ہے۔

رات رؤیا میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مضمون کو ایک اور طریق پر دکھایا اور ساتھ ہی قرآن کریم کی ایک آیت کی ایک نئی تفسیر سمجھائی جس کا لقاء سے بڑا گہرا تعلق ہے اور دراصل جو مضمون میں آج کے خطبے میں بیان کرنا چاہتا تھا اسی کی تمہید ہے جو مجھے سمجھائی گئی ہے، رؤیا بڑی دلچسپ اور عجیب سی ہے۔ میں نے دیکھا کہ ربوہ میں کھلے گھاس کے میدان میں اکیلا بیٹھا ہوں اور وہاں پاکستان سے مختلف پروفیشنل گانے والے جو ریڈیو پاکستان یا ٹیلی ویژن وغیرہ میں گانوں میں حصہ لیتے ہیں، وہ کسی تقریب میں شمولیت کی غرض سے آئے ہوئے ہیں اور ان کا جو رستہ ہے ان کے درمیان اور میرے درمیان ایک دیوار حائل ہے۔ گویا اس رستے پر جس پر وہ چل رہے ہیں ایک دیوار کی اوٹ ہے لیکن بعض جگہ در کھلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک در سے گزرتے ہوئے ان میں سے ایک شخص کی نظر مجھ پر پڑتی ہے اور خواب میں مجھ پر یہ تأثر ہے کہ یہ مجھے جانتا ہے اور میں اس کو جانتا ہوں۔ تو وہ جس طرح ایک انسان جانی پہچانی شکل کو ملنے کے لئے آگے بڑھتا ہے وہ میری طرف آگے بڑھتا ہے لیکن قریب آنے کی بجائے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر مجھے پنجابی میں کچھ شعر سناتا ہے۔ وہ جو پنجابی کے شعر ہیں وہ اس رنگ کے ہیں جیسے بعض دیہاتیوں کو یا کم علم والوں کو بعض دفعہ کوئی نکتہ ہاتھ آجائے تو اسے وہ بڑے فخر سے بڑے بڑے علماء کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر مجلسوں میں بیان کرتے ہیں

ہم نے یہ سوال کیا لیکن اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ اس رنگ کا کوئی نکتہ ہے جو ایک پنجابی نظم میں اس کا یاد کیا ہوا اور وہ سوالیہ رنگ میں میرے سامنے رکھتا ہے لیکن اس کی طرز میں تکبر یا دکھاوا نہیں بلکہ واقعۃً وہ اس نکتے میں الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس کے طرز بیان میں ایک درد پایا جاتا ہے۔ پنجابی کے وہ شعر مجھے یاد تو نہیں مگر چند شعر ہیں۔ ان کا مضمون یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی جو یہ کائنات ہے اس کے راز تو بہت گہرے ہیں اور ہماری آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں وہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں اور ہماری آنکھیں جو دیکھتی ہیں وہ ہمیں کچھ اور منظر دکھاتی ہیں اور خدا کے جو قدرت کے راز یا عرفان کی باتیں ہیں ان تک ہماری آنکھیں پہنچ ہی نہیں سکتیں اور نہ ہم ان کو سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ہماری آنکھیں ٹیڑھا دیکھ رہی ہیں اور یہ کہتے کہتے وہ بڑے درد سے اپنی آنکھ کے نچلے پردوں کو انگلیوں سے نوچ کر نیچے کر کے آنکھیں دکھاتا ہے۔ جن میں ایک قسم کی سرخی پائی جاتی ہے۔ جیسے رو رو کے سرخی پیدا ہو گئی ہو اور وہ نظم میں ہی کہتا ہے کہ دیکھیں ان آنکھوں کی وجہ سے ہمارا کیا قصور؟ ہمیں تو خدا نے آنکھیں وہ دی ہیں جو غلط دیکھ رہی ہیں اور اس کے رازوں کی حقیقت کو پا نہیں سکتیں اب بتائیں کہ ہم کیا کریں، ہم کیسے سمجھیں۔ یہ نظم جب مکمل ہو جاتی ہے تو میں اس کو اشارۃً کہتا ہوں کہ آئیں بیٹھیں اور میں آپ کو یہ مضمون سمجھاتا ہوں اور اتنے میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس بات کی خبر باقی ساتھیوں کو بھی پہنچ گئی ہے اور وہ دور دور سے واپس مڑے ہیں اور ایک دائرے کی شکل میں مجلس بنا کر میری بات سننے کے لئے بیٹھ گئے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ نے بظاہر ایک بڑی الجھی ہوئی بات پیش کی ہے لیکن میں اس کی ایک سادہ سی تفسیر آپ کو بتاتا ہوں جو ابھی دیکھتے دیکھتے آپ کو بات سمجھا دے گی اور وہ آپ کی اس عارفانہ نظم کی درحقیقت تفسیر ہے (تفسیر کا لفظ تو میں نہیں بولتا) لیکن اس مضمون کو سمجھانے کے لئے میں کہتا ہوں۔ آپ کے سامنے میں ربوہ کی مثال رکھتا ہوں۔ آپ لوگ پاکستان کے مختلف شہروں میں رہتے ہیں وہاں سے ربوہ تشریف لائے ہیں۔ یہاں آپ نے کچھ چہرے دیکھے ہیں، ان چہروں میں آپ کو خدا کا خوف دکھائی دیتا ہے۔ ان چہروں میں آپ کو عبادت کے رنگ دکھائی دیتے ہیں، ان چہروں میں آپ کو تقویٰ دکھائی دیتا ہے۔ ان چہروں میں آپ کو دین کی محبت اور اسلامی آداب اور اسلامی اخلاق دکھائی دیتے ہیں، یہاں کے گلیوں میں چلنے پھرنے والوں کو آپ نے دیکھا، یہاں مجالس میں اٹھنے بیٹھنے والوں کو آپ نے دیکھا اور آپ اپنے دل سے گواہی لے کر مجھے بتائیں کہ کیا آپ کی آنکھوں

نے آپ کو صحیح خبر نہیں دی تھی، کیا آپ کی آنکھوں نے واقعۃً آپ کو یہ اطلاع نہیں دی کہ اسلام کا جو بھی تصور ہے وہ یہاں پایا جاتا ہے اور جو مسلمانوں کی ادائیں ہونی چاہئیں وہ ان لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ پھر آنکھوں نے تو آپ سے کوئی دھوکہ نہیں کیا۔ اس کے باوجود اگر آپ کے دل کچھ اور پیغام لیں تو خدا کی بنائی ہوئی آنکھوں کا کیا قصور ہے۔ پھر میں ان سے کہتا ہوں کہ اب آپ موازنے کے طور پر چنیوٹ چلے جائیں جو ربوہ کے قریب ہی ہے اور وہاں بھی جا کر لوگوں کے چہروں کے مشاہدے کریں، وہاں بھی ان کی حرکات وسکنات کو غور سے دیکھیں۔ وہاں جا کر بھی سوچیں کہ آپ کے نزدیک قرون اولیٰ کے مسلمان کیسے ہونے چاہئیں تھے۔ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ سے فیض پانے والے مسلمانوں کی کیا ادائیں ہونی چاہئیں اور دیکھیں اور پھر اپنے نفس سے پوچھیں کہ کیا آنکھوں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا؟ کیا آنکھوں کا پیغام یہی تھا کہ یہ جو ربوہ کے سب سے شدید مخالفین میں سے ہیں یہ سچے مسلمان دکھائی دے رہے ہیں یا آپ کی آنکھوں نے آپ کو یہ بتایا تھا کہ مسلمانی کی کوئی بھی علامتیں ان میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، ان کا بولنا، ان کا چلنا پھرنا، ان کے مزاج سارے اسلام سے دور پڑے ہوئے ہیں۔ تو اب بتائیں کہ ہمارے خدا نے آپ کے ساتھ انصاف کیا کہ نہیں کیا؟ آپ کو سچی آنکھیں بخشیں کہ نہیں بخشیں؟ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج: ۴۷) والا مضمون ہے مگر اس آیت کا میں نے حوالہ نہیں دیا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہاں صدور سے مراد تاریکی کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ پس وہ دل جو خود اندھیروں میں بس رہے ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں نہ کہ وہ آنکھیں جو صحیح پیغام، جو کچھ وہ دیکھتی ہیں لوگوں تک پہنچا دیا کرتی ہیں۔

پس یہ رؤیا جو ہے یہ دیکھتے ہی میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اتنا واضح نظارہ ہے جس طرح میں آمنے سامنے دیکھ رہا ہوں اور اسی کیفیت میں میں جاگ بھی چکا تھا اور یہ رؤیا کا مضمون جاری تھا۔ یعنی صفائی رؤیا کی ایسی تھی کہ گویا بالکل جاگے ہوئے کا کوئی نظارہ ہو اور چنانچہ نیند میں اور اٹھنے میں فرق نظر نہیں آیا اور رؤیا کے جو آخری فقرے ہیں وہ میں نے جاگ کے ادا کئے جبکہ وہ منظر نظر سے غائب ہو چکا تھا۔ اس پر میری توجہ قرآن کریم کی اس آیت کی طرف پھیری گئی جس کا میں نے ان

خطبوں کے آغاز میں ذکر کیا تھا کہ:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۱﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ

(آل عمران: ۱۹۱ تا ۱۹۲)

اس آیت کا عام مفہوم اور درست مفہوم جو تمام امت میں اسی طرح رائج ہے وہ یہ ہے کہ الَّذِیْنَ سے جو مضمون شروع ہوتا ہے وہ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ کی تفسیر ہے یعنی صاحب عقل لوگ جن کا ذکر لِّاُولِی الْاَلْبَابِ کے الفاظ میں کیا گیا ہے، وہ ہیں الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا جو خدا تعالیٰ کو کھڑے ہو کر بھی یاد کرتے ہیں، بیٹھے ہوئے بھی یاد کرتے ہیں، کروٹ کے بل بھی یاد کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن جو مجھے مضمون دکھایا گیا وہ یہ تھا کہ الَّذِیْنَ میں آیات اللہ دکھائی جارہی ہیں۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ وہ آیات کیا ہیں۔ ایک پہلو اُن آیات کا یہ ہے کہ الَّذِیْنَ وہ لوگ ہیں وہ آیات جو دن رات خدا کو یاد کرتے ہیں اور ہر کروٹ پر خدا کو یاد کرتے ہیں اور دن کو بھی یاد کرتے ہیں اور رات کو بھی یاد کرتے ہیں۔ پس اس پہلو سے اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کو ہمیشہ یاد کرتے ہیں کھڑے ہوئے بھی، اور بیٹھے ہوئے بھی اور لیٹے ہوئے بھی اور زمین و آسمان اور کائنات پر غور کرتے رہتے ہیں یہ خدا تعالیٰ کی تخلیق میں آیات ہیں یعنی یہ لوگ مجسم آیتیں ہیں اور یہ لوگ دن اور رات بدلنے کی کیفیات میں بھی آیات کا مقام رکھتے ہیں۔ قرآن کریم سے آیات کی اصطلاح کا انسانوں پر چسپاں ہونا اور پھر تزکیہ کے صیغہ میں ضمیر کا اس طرف پھیرا جانا سورۃ الکہف کی اس آیت سے ثابت ہے جہاں فرمایا: اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ كَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا (الکہف: ۱۰) اسی طرح آیات کے جمع کے صیغہ کا بدل واحد کی صورت میں بیان کرنے کی مثال اس آیت کریمہ میں ہے فرمایا: فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ (آل عمران: ۹۸)۔

اس مضمون کی تائید میں پھر میرا ذہن حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی ان صفات کی طرف منتقل ہوا جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور مجھے سمجھایا گیا **کہ ان آیات کا خلاصہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں**۔ یعنی مومن جو یہ صفات رکھتے ہیں وہ آیات ہیں یعنی ایسی آیات جن کو دیکھ کر دنیا والے کائنات کی حقیقت کو پا سکتے ہیں، ایسی آیات ہیں جن کو دیکھنے کے بعد جن لوگوں میں عقل ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ یونہی تو پاگل نہیں ہو گئے، بڑے بڑے صاحب فہم لوگ ہیں ان کو کیا ہو گیا ہے کیوں ایک ایسی ذات کے عاشق ہو گئے ہیں جو ہمیں براہ راست نظر نہیں آتی۔ پس وہ ان آیات کو دیکھ کر خدا کی ذات کو پا جاتے ہیں یعنی مردہ کائنات کو دیکھ کر نہیں بلکہ آیات کے زندہ نشانات دیکھ کر، ان لوگوں کو دیکھ کر جو مجسم آیات بنے ہوئے ہیں۔

پس ربوہ والی رؤیا میں درحقیقت یہی مضمون تھا کہ تمہیں اور ذرائع سے احمدیت کی سچائی کا علم ہو یا نہ ہو، ان زندہ نشانات کو دیکھو جو احمدیت نے پیدا کئے ہیں۔ ان کے چہروں کو، ان کی عادات کو، ان کی حرکات وسکنات کو دیکھو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ خدا والے لوگ ہیں پھر تم دوسروں کی باتیں سن کر اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلاؤ گے۔ پس مجھے آنحضرت ﷺ کی صفاتِ حسنہ کو اس زاویے سے دیکھنے کی توفیق عطا ہوئی اور میرا ذہن قرآن کریم کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۙ رَّسُوْلًا (الطلاق: ۱۱، ۱۲) کسی اور نبی کے متعلق جہاں تک مجھے یاد ہے ذِكْرًا کا لفظ استعمال نہیں ہوا کہ وہ مجسم یاد الٰہی تھا۔ اور آیات کی سب سے پہلی علامت ذکر ہی بیان فرمائی گئی ہے۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ اور دن رات خدا کی ذات میں محو اور خدا کی یاد میں اپنے وجود کو کھو دینے والا وجود حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کا ہی وجود تھا۔ چنانچہ یہ نہیں فرمایا کہ یہ یاد کرنے والا وجود ہے۔ فرمایا ذِكْرًا یہ اللہ کی مجسم یاد ہے۔ اس کے وجود کو یاد سے الگ نہیں دکھایا جا سکتا۔ کلیۃً خدا کی یاد اس کے وجود کے ذرے ذرے میں سرایت کر چکی ہے۔ پس تمام آیات جو کائنات میں پائی جاتی ہیں ان کا خلاصہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور آیت کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے جسے دیکھ کر انسان دوسرے نشانات کو جو پچھلی باتیں ہیں ان کو پا جائے۔ گویا ان معنوں میں آیت علامت کا حکم رکھتی ہے۔ پس جتنی بھی آیات ہیں ان کو دیکھ کر صاحب آیات یعنی خدا تعالیٰ کا یاد آجانا یہ کسی چیز کے آیت ہونے کی

دلیل بنتا ہے۔ پس سب سے زیادہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کو دیکھ کر خدا یاد آ سکتا ہے اس سے بڑھ کر کسی اور وجود کو دیکھ کر خدا ظاہر نہیں ہو سکتا۔

پھر آنحضرت ﷺ ہی کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (الاعراف:۲۰۶) کہ اپنے رب کو یاد کر فِيْ نَفْسِكَ اپنے دل میں تَضَرُّعًا نہایت عاجزی کے ساتھ وَّخِيْفَةً اور خدا کے خوف کے ساتھ وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ اور اس طرح بھی یاد کر کہ تیری زبان سے بے شک کوئی الفاظ نہ نکل رہے ہوں لیکن یاد الٰہی جاری و ساری ہو بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ صبح بھی اور شام کو بھی بدلتے ہوئے دن اور رات میں وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ اور کسی حالت میں بھی اس یاد الٰہی سے غافل نہ رہنا۔

پس اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ جو ہے وہ آیات یہی حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور یہ بات مبالغہ نہیں ہے۔ کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ کائنات کی نشانیوں کو جو جان نہیں رکھتیں، جو کوئی روح نہیں رکھتیں ان کو دیکھنے کے بعد جس خدا کی طرف اشارہ ہوتا ہے وہ ایک فلسفیانہ اشارہ ہوتا ہے۔ صرف مومن ہے جو ان نشانات کو دیکھ کر ایک زندہ خدا کی طرف حرکت کرتا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ اس نے براہ راست ان نشانوں سے خدا کی طرف راہنمائی حاصل کی، بلکہ پہلے ہی اسے خدا کے وجود کا علم ہو چکا ہوتا ہے، خدا کے وجود کو وہ کسی صاحب خدا سے پا چکا ہوتا ہے، اس کو حاصل کر چکا ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے ساری نشانیاں خدا کی نشانیاں بن جاتی ہیں۔ لیکن دنیا دار جب ان نشانیوں کو دیکھتے ہیں تو ایک خدا کا تصور تو ضرور باندھتے ہیں اور بہت سے فلسفیوں اور سائنس دانوں نے ان باتوں کا اپنے کلام میں ذکر کیا ہے اور کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ہماری آنکھوں سے بھی ایک پردہ اٹھا اور ہمیں بھی معلوم ہوا کہ ان رازوں کے پیچھے کائنات کا ایک خالق موجود ہے۔

پس اس خالق تک وہ پہنچے لیکن اس سے آگے نہیں۔ ایک تصوراتی خالق ان کے سامنے ابھرا لیکن ایک ایسے وجود کے طور پر جو ان کا دوست بن جائے، ان کا رفیق ہو جائے، ان کا محبوب ہو جائے، ان کے ساتھ زندہ رہے اور اپنی زندگی سے ان کو زندہ رکھے، ایسے وجود تک ان کی رسائی کی

کوئی خبر نہیں ملتی۔

پس یہ آیات کہاں، اور کہاں وہ آیات جن کا نام محمد مصطفی ﷺ ہے۔ جو ان تمام آیات کا خلاصہ ہیں۔ جنہوں نے لاکھوں کروڑوں بندوں کو اپنا وجود دکھا کر خدا کا وجود دکھا دیا۔ اور خدا نما ہو گئے۔ پس مجسم ذکر الٰہی بن کر اور دن اور رات خدا کو یاد کر کے ہر وہ شخص جو حضرت محمد مصطفی ﷺ کی پیروی کرتا ہے وہ بھی اپنے اپنے رنگ میں خدا نما وجود بن سکتا ہے اور یہی احمدیت کا مقصد ہے۔ جب تک احمدی اس پیغام کو سمجھ کر اس پر عمل کرتے رہیں گے اور جب تک امام جماعت احمدیہ آنے والوں کو فخر سے یہ کہہ سکے گا کہ آؤ اور احمدیوں کا ہماری بستیوں میں مطالعہ کرو اور دیکھو کہ کیا دوسری بستیوں میں بسنے والوں سے ان میں کوئی فرق تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت تک یقیناً احمدیت زندہ رہے گی اور احمدی ان آیات میں شامل رہیں گے جن کا اس آیت کریمہ میں ذکر موجود ہے جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی اور آنحضرت ﷺ کی غلامی سے ان کو بھی یہ آیات میں داخل ہونے کا شرف نصیب ہوگا اگر یہ فرق مٹ گئے اگر احمدیوں کو دیکھ کر خدا یاد نہ آئے بلکہ غیر اللہ یاد آنے لگیں تو پھر ایسا احمدی نہ آیات اللہ میں شمار ہو سکتا ہے نہ آنحضرت ﷺ کی غلامی میں غلاموں میں شامل ہونے کا حق رکھتا ہے۔

اس مضمون کے تعلق میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے میں اب آپ کو پھر دوبارہ پچھلے خطبات کی طرف لے کے جاتا ہوں۔ میں نے آپ سے یہ گزارش کی تھی کہ خدا کو پانے کے لئے کامل عجز اختیار کرنا ضروری ہے اور خدا کے عاجز بندوں سے تعلق بڑھانا ضروری ہے۔ خدا کے غریب اور بے سہارا اور کمزور بندوں کے لئے دل میں گہری ہمدردی کا پیدا ہونا ضروری ہے یہاں تک کہ آپ ان کے ساتھ ہو جائیں۔ ان میں سے اپنے آپ کو شمار کرنے لگیں، ان کے دکھ بانٹنے لگیں، اپنے سکھ ان کے ساتھ بانٹنے لگیں، یہ لقاء کی شرط ہے آخری منزل نہیں ہے، منازل میں سے ایک منزل ہے۔ یہ وہ منزل ہے جو آپ کو عبد کے ایک معنی سمجھاتی ہے۔ عبد یعنی بندہ جب خدا کی طرف منسوب ہو تو اسے عبداللہ کہا جاتا ہے اور اللہ کا بندہ بننے سے پہلے خدا کے عام بندوں میں شامل ہونا اور عام معنوں میں عبد بننا ضروری ہے۔ ورنہ عبداللہ بننے کا انسان اہل نہیں بن سکتا۔ پس پہلے آپ عبد کے عام معنی میں عبد بنیں اور عبد کا عام معنی ہے ایسا غلام جس کا کچھ بھی نہ ہو۔ پس جب اس تصور کے ساتھ آپ

عاجزی اختیار کریں گے کہ آپ کا کچھ بھی نہیں سب مالک کا ہے اور آپ تو ایک جواب دہ ہیں اس سے بڑھ کر آپ کی کوئی بھی حیثیت نہیں تو آپ کے سارے تکبر منہدم ہو جائیں گے۔ آپ ایک بچھی ہوئی راہ بن جائیں گے اور کوئی بھی اونچ نیچ اور کجی آپ کی ذات میں باقی نہیں رہے گی حقیقۃً آپ کو اپنے عجز کا عرفان نصیب ہو جائے گا۔ پھر آپ عبادت کے لائق بنیں گے پھر عبادت کی ساری مسافت آپ کے سامنے کھلی پڑی ہوگی پھر جتنا زیادہ آپ خدا کی عبادت میں یعنی بندگی میں آگے بڑھیں گے اتنا ہی زیادہ آپ عبد کہلانے کے مستحق ہوں گے۔

پس آنحضرت ﷺ نے غریبی اور عجز کی راہ سے اپنے خدا کو پانے کی راہ اختیار فرمائی اور جب آگے بڑھے تو پھر عبادت میں اتنی ترقی کی کہ عبادت کے نتیجے میں پھر آپ کو وہ لقاء نصیب ہوئی جس لقاء کے حصول کے لئے میں آپ کو مسلسل نصیحت کر رہا ہوں اور دیکھیں کہ عبد کے ہر مفہوم میں آپ درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ عبد کے عام مفہوم میں یعنی عاجزی اور حد سے زیادہ تذلل اختیار کرنا اور اپنے نفس کی طرف کوئی بھی بڑائی منسوب نہ کرنا، اس میں حضرت رسول اکرم ﷺ سے بڑھ کر کوئی عاجز بندہ کبھی دنیا میں پیدا نہیں ہوا اور پھر اپنے وجود کو کلیۃً خدا کے سپرد کر دینا اور اس کی عبادت میں منہمک ہو جانا اور اس کی عبادت میں اپنے آپ کو کھو دینا اس پہلو سے بھی دنیا میں کبھی کوئی انسان آپ سے بڑھ کر عبادت گزار پیدا نہیں ہوا۔ پس اس لحاظ سے عبد کامل تھے تو آپ تھے عام بندے کے معنوں میں بھی، انسانی معنوں میں بھی آپ انسانیت کے درجہء کمال کو عجز میں درجۂ کمال حاصل کر کے پہنچے اور عبد ہونے کا حق ادا کر دیا اور خدا کی عبادت میں بھی عاجزانہ عبادت کے ذریعے آپ درجہ کمال کو پہنچے اور خدا کے عاجز بندہ ہونے کا حق ادا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اگر چہ مختلف انبیاء کو مختلف القابات ملے ہیں مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے سوا کسی کو عبداللہ نہیں کہا گیا اور یہ سب سے بڑا لقب ہے جو کسی بندے کو خدا تعالیٰ عطا کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ ان معنوں میں کہ عقلی لحاظ سے اس سے بڑا لقب موجود نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام خود تو یہ کہتے ہیں کہ انی عبد اللہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور ہر نبی ہی نہیں ہر بندہ یہی دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا کا بندہ ہوں جسے ذرا بھی عرفان حاصل ہو وہ یہ کہتا ہے کہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ پھر ایک جگہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ بھی عرض کرتے ہیں یعنی

ان کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کو اس بات میں قطعاً ایک ذرہ بھی باک نہیں تھی کہ وہ خدا کا بندہ کہلائیں لیکن خدا نے خود کسی کو عبداللہ کا لقب دیا ہو اس کی اور کوئی مثال دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے ایک زمانے میں مواز نہ مذاہب کا شوق تھا۔ مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا۔ ہوسکتا ہے کہ میرے علم میں نہ آیا ہو مگر میرے علم میں جہاں تک میں نے دیکھا کسی اور نبی کی کتاب میں اس کے لئے یہ لقب نظر نہیں آیا کہ خدا نے اسے مخاطب کر کے عبداللہ فرمایا ہو۔ ہاں عبادت کے دعویدار انبیاء جیسا کہ ہونا چاہئے تھا اور بندہ ہونے کے دعویدار موجود تھے عبد کے دوسرے معنوں میں لیکن خدا کی طرف سے عبداللہ کا لقب نصیب ہونا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی کے حصے میں تھا۔

پس وسیلے کا مضمون چل رہا تھا وسیلے کا ایک پہلو میں نے آپ کو گزشتہ خطبے میں دکھایا کہ وہ بندوں کے ساتھ عاجزی ہے جب تک بندوں کے ساتھ انسان کی عاجزی مستحکم نہ ہو جائے اور مستقل رنگ نہ اختیار کر لے اس وقت تک خدا کے ساتھ عاجزی کی اہلیت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ خدا کے سامنے تو بظاہر ہر اندرونی نفس کے متکبر کے لئے بھی بڑائی کا سوال نہیں ہوتا۔ اس کو کیسے پتا چلے گا کہ واقعۃً وہ عاجز ہے یا خدا کی عظمت اتنی ظاہر و باہر ہے کہ اس کے سامنے عاجزی اختیار کئے بغیر چارا کوئی نہیں۔ جب عاجز بندوں کے سامنے انسان عجز محسوس کرتا ہے اور ہر قسم کی بڑائی کو اپنے نفس سے مٹا دیتا ہے تب وہ ان معنوں میں عبد بنتا ہے کہ پھر وہ خدا کی عبادت کا مستحق اور اہل ہو جاتا ہے اور پھر اس کی عبادت کو عاجزانہ عبادت قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آنحضرت ﷺ کے عبد ہونے کے مضمون کو بالکل اسی رنگ میں پیش فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

> ''عبودیت سے مراد وہ حالتِ انقیاد اور موافقت تامہ اور رضا اور وفا اور استقامت ہے جو خدا تعالیٰ کے خاص تصرّف سے آنحضرت ﷺ میں پیدا ہوئی جس سے آپ اس راہ کی طرح ہو گئے جو صاف کیا جاتا اور نرم کیا جاتا اور سیدھا کیا جاتا ہے۔''

انقیاد سے مراد انتہائی تذلل ہے۔ انقاد جب عربی میں کہا جاتا ہے تو مراد ہے کہ ایک آدمی اپنے آپ کو کلیۃً بچھا دے، خاک میں ملا دے، کامل تذلل اور عجز اختیار کرے اور اس کے بعد آپ فرماتے ہیں ''موافقت تامہ'' پھر خدا تعالیٰ کی ذات سے ایسی ہم آہنگی محسوس کرے کہ اس کے نتیجے

میں رضا اور وفا پیدا ہو۔ اس مضمون کو نسبتاً زیادہ کھولتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک اور جگہ آنحضور ﷺ کے اس پہلو سے وسیلہ ہونے کا ذکر یوں فرماتے ہیں۔۔

''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام عبد بھی ہے اور اس لئے خدا نے عبد نام رکھا کہ اصل عبودیت کا خضوع اور ذُلّ ہے''

یعنی خضوع کا معنی ہے عاجزی اور ذل کا معنی ہے بالکل اپنے آپ کو گرا دینا۔ لاشئ محض سمجھنا، اپنے آپ کو بالکل چھوٹا بنا دینا۔

''اور عبودیت کی حالت کاملہ وہ ہے جس میں کسی قسم کا غلو اور بلندی اور عُجب نہ رہے۔''

یعنی اگر خدا کی عبودیت اختیار کرنی ہے تو یہ لازم ہے کہ آپ کی ذات میں کسی قسم کی کوئی بلندی، خود پسندی، کوئی ریا کاری وغیرہ باقی نہ رہے۔

''اور صاحب اس حالت کا اپنی عملی تکمیل محض خدا کی طرف سے دیکھے''

اور انسان یہ بھی محسوس کرے کہ جو کچھ مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ہو رہا ہے۔ میری کوششوں سے حاصل نہیں ہو رہا۔۔ پس یہ وہی مضمون ہے جس کو آپ نے فرمایا۔ جو خدا تعالیٰ کے خاص تصرف سے آنحضرت ﷺ میں پیدا ہوئی۔ فرماتے ہیں

اور صاحب اس حالت کا اپنی عملی تکمیل محض خدا کی طرف سے دیکھے اور کوئی ہاتھ درمیان نہ دیکھے۔ عرب کا محاورہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ مَوْرٌ مُعَبَّدٌ وَطَرِیْقٌ مُعَبَّدٌ۔ جہاں راہ نہایت درست اور نرم اور سیدھا کیا جاتا ہے اس راہ کو طریق معبد کہتے ہیں۔ پس آنحضرت ﷺ اس لئے عبد کہلاتے ہیں کہ خدا نے محض اپنے تصرف اور تعلیم سے ان میں عملی کمال پیدا کیا اور ان کے نفس کو راہ کی طرح اپنی تجلیات کے گزرنے کے لئے نرم اور سیدھا اور صاف کیا''

(ایام الصلح روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ: ۳۹۴)

اب یہ دیکھیں کہ وسیلہ کی کیسی اعلیٰ تعریف ہے اور کیسی کامل تعریف ہے۔ وسیلہ وہ ہوتا ہے جو ایک چیز کو دوسرے سے ملا دیتا ہے۔ جیسے پل دریا کے عبور کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو وسیلہ ان معنوں میں نہیں پیش کر رہے کہ گویا نعوذ باللہ آپ وہ راہ ہیں جن پر قدم مارتے ہوئے لوگ آگے بڑھیں گے۔ ایسا حیرت انگیز عرفان حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نصیب ہوا کہ اس کو بندہ اپنی کوشش سے تمام عمر سجدوں میں سر رگڑ کے بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ وہ عرفان ہے جو نازل ہوتا ہے، جو خدا کی طرف سے نصیب ہوتا ہے ۔فرماتے ہیں آپ نے اپنے نفس کو ایک بچھی ہوئی راہ بنا دیا اور وہ راہ اس غرض سے نہیں تھی کہ بندے اسی پر قدم رکھیں اس لئے تھی کہ خدا کی تجلیات اس پر دوڑیں اور ان راہوں سے خدا بندوں تک پہنچے۔

پس جو حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کو وسیلہ بنانا چاہتا ہے اسے بندوں کے مقابل پر بھی ایک کامل عجز اختیار کرنا ہوگا اور خدا کے مقابل پر بھی ایک کامل عجز اختیار کرنا ہوگا اپنی عبادت کو عاجزانہ رنگ بخشنے ہوں گے اور پھر آنحضرت ﷺ سے عبادت کے رنگ سیکھتے ہوئے خدا کی تجلیات کا انتظار کرنا ہوگا کہ جو محمد مصطفی ﷺ کے وسیلے سے اس تک پہنچیں گی اور ان راہوں سے آئیں گی جن راہوں سے حضرت محمد مصطفی ﷺ کو وہ نصیب ہوئیں۔

پس آنحضرت ﷺ اس لئے عبد کہلاتے ہیں کہ خدا نے محض اپنے تصرف اور تعلیم سے ان میں عملی کمال پیدا کیا اور ان کے نفس کو راہ کی طرح اپنی تجلیات کے گزرنے کے لئے نرم اور سیدھا اور صاف کیا اور اپنے تصرف سے وہ استقامت جو عبودیت کی شرط ہے ان میں پیدا کی۔ پس وہ علمی حالت کے لحاظ سے مہدی ہیں اور عملی کیفیت کے لحاظ سے جو خدا کے عمل سے ان میں پیدا ہوئی عبد ہیں کیونکہ خدا نے ان کی روح پہ اپنے ہاتھ سے وہ کام کیا ہے جو کوٹنے اور ہموار کرنیوالے آلات سے اس سڑک پہ کیا جاتا ہے جس کو صاف اور ہموار بنانا چاہتے ہیں اور چونکہ مہدی موعود کو بھی عبودیت کا مرتبہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے حاصل ہوا اس لئے مہدی موعود میں عبد کے لفظ کی کیفیت غلام کے لفظ سے ظاہر کی گئی یعنی اس کے نام کو غلام احمد کر کے پکارا گیا۔

جہاں تک عبودیت کا تعلق ہے۔ آپ نے بار بار حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اقتباسات میں پڑھا ہوگا اور جیسا کہ میں نے پڑھ کر بعض اقتباسات سنائے ہیں ان میں سنا بھی ہے کہ ہمیشہ آپ نے اس کے ساتھ استقامت کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ عبادت جو عارضی ہو اور آنے جانے

والا رنگ رکھتی ہو جیسے جمعۃ الوداع کا ایک تصور پایا جاتا ہے کہ سال کے بعد آئے گا اور آتے ہی چودہ طبق روشن کر کے ہمیشہ کی غفلتوں کی تلافی کرتے ہوئے یہ جمعہ اپنے استحقاق کے لحاظ سے رخصت ہو جائے گا۔ یعنی پھر اس جمعہ کے حق ادا کرنے کے لئے پھر ہمیں کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسا جمعہ ہے کہ جو آئے گا اور جس طرح ایک پیروں اور فقیروں کا تصور ہے کہ آئے اور دو جہان بخش گئے اس طرح یہ جمعہ دو جہان بخش کے چلا جائے گا۔ یہ تصور بالکل جاہلانہ اور غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم سے اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآن کریم سے یہ سند ملتی ہے کہ اس جمعہ میں یا اس برکت والی رات میں جو اس جمعہ کی رات کو بھی ہو سکتی ہے اور آخری عشرے میں کوئی اور رات بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی گھڑی ضرور انسان کو نصیب ہو سکتی ہے جو اس کے دین و دنیا سنوار دے مگر ان معنوں میں نہیں کہ فقیر نے کچھ دے دیا کہ جاؤ اب چھٹی کرو جو چاہے کرتے پھرو بلکہ ان معنوں میں کہ جو کچھ سدھارے اس کو پھر قائم رکھے۔ ایک تبدیل شدہ وجود پیدا کرے اور وہ تبدیلیاں ایسی ہوں کہ پھر دوبارہ مائل بہ انحطاط نہ ہو سکیں۔ وہ رفعتیں جو وہ جمعہ یا وہ لمحے بخش جائیں، جو لیلۃ القدر کے بعض لمحے بخشتے ہیں وہ ایسی پاک تبدیلیاں ہیں کہ جو آ کر ٹھہر جانے والی ہیں۔ مستقل وجود پر نقش ہو جانے والی ہیں۔ وہ وصل کی تبدیلیاں ہیں وداع کی تبدیلیاں نہیں۔ پس دنیا کے اکثر لوگوں کے لئے یہ جمعہ وداع کہہ کر رخصت ہو جاتا ہوگا مگر وہ جن کے لئے یہ وصل کا پیغام لاتا ہے وہ ان سے پھر کبھی جدا نہیں ہوتا۔

یہ وہ استقامت کا مفہوم ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ عبادت اور وصل الٰہی کے مضمون کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ قرآن کریم بھی اس مضمون کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ (مریم:۶۶) قرآن کریم فرماتا ہے جس سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ مضمون سیکھا ہے اور قرآن کریم ہی میں آپ کے کلام کی بنیاد ہے۔ تو قرآن کریم فرماتا ہے۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ وہ زمین اور آسمان کا رب ہے جو تمہارا رب ہے وَمَا بَيْنَهُمَا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا بھی رب ہے۔ فَاعْبُدْهُ اس کی عبادت کر۔ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ اور اس کی عبادت پر صبر اختیار کر۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا کیا تو اس جیسی کسی اور ذات کو جانتا ہے۔ کیا کبھی تو نے سنا ہے کہ خدا جیسی بھی کوئی اور ذات کائنات میں موجود ہے۔ پس

جب اس جیسا ہے کوئی نہیں تو اس کا در چھوڑ کر جائے گا کہاں؟ جو تعلق اس سے باندھے اس کو پکڑ کر بیٹھ رہے اور پھر کبھی اس سے علیحدہ نہ ہو۔ پس یہ جمعہ جو رمضان کا آخری جمعہ ہے یقیناً برکتوں والا دن ہے اور تمام سال کے دنوں میں ایک غیر معمولی عظمت اور شان اور امتیاز رکھتا ہے لیکن انہیں کے لئے جو اس جمعہ میں جو برکتیں حاصل کرتے ہیں ان کو پھر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور صبر اختیار کرتے ہیں۔

صبر کا مضمون استقلال کو بھی ظاہر کرتا ہے اور ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جسے سمجھانا ضروری ہے۔ بعض ہمارے احمدی دوست جو عبادات کی طرف متوجہ ہیں اور ان کو جلدی پھل نہیں لگتا۔ وہ بعض دفعہ بہت بے چین ہو جاتے ہیں، بعض تو پھر یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ ہم نے تو اتنی دیر عبادتیں کی ہیں ہمیں مزہ ہی نہیں آیا، عبادتوں کو پھل ہی نہیں لگ رہا، دعائیں قبول نہیں ہو رہیں۔ جو روح میں خدا کی طرف ایک قسم کا تموج پیدا ہونا چاہئے اور اس کے نتیجے میں جو لذت حاصل ہوتی ہے اس سے ہم عاری ہیں تو ہم تو اب تھک کے سمجھتے ہیں کہ یوں کوشش بے کار ہے۔ یعنی بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے یہاں تک لکھا۔ لیکن اکثر ایسے ہیں جو بڑی عاجزی اور تذلل سے اپنی فکروں کو میری طرف منتقل کرتے ہوئے دعا کی تحریک کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ہمیں بچاؤ خدا کے لئے کچھ کروا یسی دعا کرو کہ ہمارا دل بھی جاگ اٹھے ہماری عبادتیں بھی زندہ ہو جائیں تو ان کے لئے قرآن کریم یہ پیغام دے رہا ہے کہ عبادت کے ساتھ صبر کا مضمون وابستہ ہے۔

ہر شخص کی پختگی کے لئے ایک وقت درکار ہوا کرتا ہے اور ہر شخص کے لئے وہ وقت الگ الگ ہوا کرتا ہے۔ کسی نے سفر کہاں سے شروع کیا ہے اور کسی کی اندرونی صلاحیتیں کیا ہیں یہ دو مضمون ہیں جو مل کر اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کب عبادت اپنی اس پختگی کو پہنچے گی کہ اس کے شیریں پھل انسان کو لذت سے بھر دیں گے۔ ایک انسان ہے جو بہت سے اندرونی گناہوں میں ملوث، بہت دیرینہ خطاؤں میں مبتلا اور کئی پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں ایک دن عبادت کر کے ایک دم شور ڈال کر خدا تعالیٰ کو راضی کر لوں اور اچانک مجھے خدا تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو جائے۔ اس وقت کی اس کی کیفیت یقیناً بڑی سخت بے قراری کی کیفیت ہوگی لیکن وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ: ۱۳۳) کا مضمون یہ بتاتا ہے کہ عبادت کو فوری طور پر لازماً پھل نہیں لگا کرتا۔ بہت سے لمبے ایسے دور سے گزرنا ہوگا جس میں انسان پہلے اپنے نفس کی آگاہی حاصل کرے اپنی کمزوریوں کا عرفان حاصل

کرے، اس عرفان کو پھر عرفان الٰہی کے راستوں پر منتقل کرے اور اپنے عرفان کے رستے سے خدا کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی عبادت میں ایک نئی تازگی پیدا ہونی شروع ہو جائے گی۔ اس کی عبادت میں زندگی کے آثار ظاہر ہوں گے اور اس کی عبادت میں مزے کی کیفیت پیدا ہو جائے گی لیکن یہ لمبے غور، فکر اور مجاہدے کا مضمون ہے۔ اس سے تھکنا نہیں چاہئے اگر صبر کی طاقت نہیں ہے تو پھر عبادت کی بھی طاقت نہیں۔ پس لازماً عبادت کا صبر کے ساتھ اور استقلال کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہے اور یہ مضمون یاد رکھنا چاہئے کہ اگر خدا کی عبادت میں کچھ نہیں ملا تو پھر بھی اسے چھوڑ کر جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا پھر اور کون ہے جو خدا کے سوا تمہیں عبادت کے قابل دکھائی دیتا ہے۔ پس تمہارے لئے تو چارا ہی کوئی نہیں بے اختیاری کا عالم ہے۔

وہی واقعہ جو میں پہلے بھی آپ کو سنا چکا ہوں لاہور کے ایک درویش کا یاد آجاتا ہے۔ اس موقعہ پر بیان کے لائق بہت موزوں ہے۔ ایک درویش تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک دن اس نے ترنگ میں آکر خدا سے یہ عرض کی کہ اے خدا مجھے تیری دنیا پسند نہیں آئی اور یہ کہہ کر وہ باہر بازاروں میں کودتا اچھلتا ہوا نکلا اور اعلان کرنا شروع کیا کہ ہم نے خدا کو کہہ دیا جو کہنا تھا اور بڑا ہی خوش دکھائی دیتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ تم نے خدا کو کیا کہا ہے کیوں اتنے خوش ہو رہے ہو اس نے کہا کہ میں نے تو خدا کو صاف کہہ دیا ہے کہ مجھے تیری دنیا پسند نہیں آئی۔ کچھ دن کے بعد اس کو پھر بازاروں میں دیکھا گیا اور نہایت ہی مضمحل، پژمردہ سر نیچے پھینکا ہوا بے حد اداس۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے آج کیوں تم اتنے اداس ہو؟ اس نے کہا کہ جواب آ گیا ہے۔ کہا۔ کیا جواب آیا ہے؟ جواب یہ آیا ہے کہ پھر جس کی دنیا پسند آتی ہے اس میں چلے جاؤ۔ چھوڑ دو میری دنیا اگر پسند نہیں اور ہے ہی کوئی نہیں۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا میں یہ پیغام ہے۔ کہ اے عبادت سے تھک جانے والو! اے جلدی ہمت ہار دینے والو! اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری عبادت کو پھل نہیں لگ رہے۔ اس لئے تم اس عبادت کو چھوڑ دو تو پھر چھوڑ کے جاؤ گے کہاں؟ خدا کے سوا بھی کوئی ذات سنی ہے جو اس جیسی ہو۔ اگر یہ رحمان و رحیم یہ رحیم و کریم خدا تمہارے دل کے لئے جیتا نہیں جا سکتا تو پھر دنیا میں اور کوئی ذات تمہارے لئے جیتی نہیں جا سکے گی۔ پس جو زور لگانا ہے اس در پر لگاؤ، جو سجدے بھرنے ہیں اسی آستانے پر بھرو اور اپنی پیشانی کو یہیں رگڑو اس کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآن کریم نے

بڑی شان کے ساتھ کھول کر ہمارے سامنے رکھا ہے۔ پھر اس جمعہ کا کہاں سے تصور پیدا ہوا جو آیا اور سب کچھ بخش کر چلا گیا اور پھر انسان عبادتوں سے غافل ہو کر یہ سمجھ لے اب وداع ہو گیا ہے۔ اب میں یہ چاہوں کرتا پھروں۔ صبر اور استقامت کے سوا کبھی بھی عبادت آپ کو کچھ عطا نہیں کر سکتی۔

پھر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جن کی عبادتیں ان کے ذاتی منافع سے وابستہ ہوتی ہیں اور خدا تعالیٰ کی محبت کے ساتھ تعلق نہیں رکھتیں۔ ایسے بھی بہت سے لوگ ہیں جو اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب ان کی دعائیں اس رنگ میں قبول نہ ہوں جس طرح وہ چاہتے ہیں تو وہ اس عبادت سے الگ ہو جاتے ہیں، اس سے غافل ہو جاتے ہیں یا بعض دفعہ بدظن ہو کر خدا تعالیٰ ہی کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ قرآن کریم ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (حج:۱۲)

ایسے لوگ بھی تمہیں بنی نوع انسان میں دکھائی دیں گے جو خدا کی عبادت کناروں پر بیٹھ کر کرتے ہیں یعنی وہ اللہ میں سفر اختیار نہیں کرتے بلکہ اس طرح جیسے کنارے پر بیٹھ کر گھر سے باہر کوئی فقیر مانگ رہا ہو۔ خدا تعالیٰ تو کہتا ہے کہ آؤ اور میری ذات میں سفر کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور پھر مجھ سے مانگو لیکن وہ اپنے آپ کو خدا کے سپرد نہیں کرنا چاہتے ان کو اس تصور میں کوئی مزہ نہیں ملتا۔ کوئی لذت دکھائی نہیں دیتی کہ وہ خدا ہی کے ہو جائیں پس وہ چاہتے ہیں کہ کنارے پر بیٹھ کر ہاتھ بڑھا کر جو مانگنا ہے مانگ لیں۔ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ (حج: ۱۲) پھر خدا کی طرف سے کوئی خیر ان کو عطا ہو جائے، کوئی بھیک مل جائے تو بڑے مطمئن ہو جاتے ہیں جس طرح فقیر دعائیں دیتا چلا جاتا ہے، کہتے ہیں جی خدا سے ہم نے پالیا۔ جو ہم نے پانا تھا جی پالیا۔ لیکن وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ اگر خدا ان کو آزمائش میں مبتلا کر دے۔ ان کی طلب پوری نہ فرمائے تو وہ اپنے منہ کے بل یا منہ کا رخ اختیار کر کے جدھر منہ اٹھے۔ یہ محاورہ اس قسم کا ہے کہ جس کا ترجمہ یوں ہونا چاہئے۔ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ کہ پھر جدھر منہ اٹھے پکٹ دوڑ پڑتے ہیں کہ کچھ نہیں ملا جی کچھ نہیں ملا۔

یہ ویسا ہی قصہ ہے اس سے ملتا جلتا ایک لطیفہ ہے کہ ایک شخص نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو اس نے کہا کہ خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ تو اس نے واقعۃً ایک جائے نماز خریدی اور ایک

جگہ بچھا کر قبلہ رخ ہو کر عبادت شروع کی اور خدا سے مانگنے لگا اس کی بدقسمتی اتفاق سے اس وقت زلزلہ آ گیا اور وہ پیچھے کی طرف گرا فوراً جائے نماز لپیٹی اور کہا کہ اے خدا! اگر تو میری طلب نہیں پوری کرتا تو دھکے تو نہ دے یہ کون سا انصاف ہے۔ پس یہ ظالم لوگ واقعۃً یہ کہتے ہوئے دنیا میں منادی کرنے نکل جاتے ہیں کہ خدا کی عبادت سے کچھ بھی نہیں ملا دھکے ہی ملے۔ ہم نے تو عمر ضائع کر دی خواہ مخواہ مسجدوں کے پھیرے لگائے۔ بزرگوں کو دعاؤں کے لئے لکھا۔ وہاں سے کچھ بھی نہیں ملتا بے کار ہے، فضول ہے۔ اپنا جو کچھ ہے وہ بھی ضائع کرنے والی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ یہ وہ بدنصیب لوگ ہیں جن کی نہ دنیا رہتی ہے نہ آخرت رہتی ہے۔ پس ایسی عبادت نہ کرو جس کے نتیجے میں نقد نقد سودے کے مطالبے ہر وقت جاری رہیں اور یہ کہو کہ اے خدا! دے مجھے، میرے مطالبے پورے کر ورنہ پھر میں تیری عبادت نہیں کرتا خدا کو آپ کی عبادت کی کیا پرواہ ہے۔ اگر سارے انسان بھی اس کی عبادت چھوڑ دیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے کچھ بھی فرق نہیں پڑتا کیونکہ عبادت بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ خدا کے فائدے کے لئے نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی تو دنیا بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ ان کی آخرت بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ کچھ بھی نہیں رہتا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ یہ ہے وہ کھلا کھلا گھاٹا ہے جس سے ہم تمہیں متنبہ کرتے ہیں۔

پس رمضان المبارک میں آج کا دن بھی ایک غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ سارا رمضان ہی وصل کے مضمون سے گہرا تعلق رکھتا ہے کیونکہ میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا کہ ہر عبادت کی کوئی جزاء بیان فرمائی گئی ہے اور روزوں کی جزاء خدا نے خود اپنے آپ کو ظاہر فرما دیا ہے۔ فرمایا ہے روزے کی جزاء میں ہوں کیونکہ روزے میں ساری عبادتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور عبد کا مضمون اپنے کامل وجود کے ساتھ، اپنی کامل شان کے ساتھ انسان میں ظاہر ہوتا ہے کیونکہ روزہ آپ کو کسر نفسی سکھاتا ہے، غریبوں کی ہمدردی سکھاتا ہے، ان کی بھوک اور ان کی پیاس کا احساس دلاتا ہے، ان کی بے چارگی سے آپ کو باخبر کرتا ہے۔ روزے کے نتیجے میں آپ عام عبادتوں سے بڑھ کر عبادت کرتے ہیں اور اپنے جائز حقوق بھی خدا تعالیٰ کی خاطر چھوڑ دیتے ہیں جو عام روزمرہ کی زندگی میں آپ کے لئے جائز ہیں۔ پس تمام عبادتوں کا خلاصہ روزے میں ہے پس اسی لئے اس کی جزاء خدا تعالیٰ نے خود اپنی

ذات کو بیان فرمایا کہ روزے کی جزاء میں خود ہوں۔

اور پھر آخری عشرے میں تو عبادت ایک خاص معراج تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت فرماتی ہیں کہ:

كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا دخل العشر شدمئزره واحيا ليله وايقظ اهله (بخاری کتاب الصوم حدیث: ۱۸۸۴)

کہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تھا (یہاں عشر کو رفع کی حالت میں لکھا ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ عشرہ آیا ہے اور جو ترجمہ ہے وہ یہ لکھا ہوا ہے کہ **دخل العشر** کہ رسول اللہ ﷺ عشرہ میں داخل ہوتے تھے تو یہ ممکن ہے یہ لکھنے والی کی غلطی ہو یا یہی مضمون ہو کہ جب آخری عشرہ آجایا کرتا تھا) **شدمئزرہ** آپ اپنی کمر کس لیا کرتے تھے اور اپنی رات کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ **وایقظ اھلہ** اور اپنے گھر والوں کو بھی جگایا کرتے تھے۔

وہ شخص جس کی ہر رات زندہ ہو جس کا یہ دستور ہو کہ اپنے گھر والوں کو ہمیشہ جگاتا ہو اس کے متعلق جب یہ کہا جائے کہ آخری عشرہ میں یہ کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر معمولی فرق پڑا کرتا تھا۔ اس وقت عبادت اپنی آخری حد کو پہنچا کرتی تھی راتیں جاگ اٹھتی تھیں۔ خوابیں نور کمانے لگتی تھیں اور غیر معمولی شان کے ساتھ خدا آپؐ پر ظاہر ہوتا تھا اور اسی نظارے میں شامل کرنے کے لئے اپنے اہل وعیال کو بھی جگایا کرتے تھے کہ اٹھو اٹھو تم بھی اس نعمت سے محروم نہ رہو۔ پس اب جو باقی دن رہ گئے ہیں ان دنوں میں آپ بھی یہی کر کے دیکھیں کیونکہ خالی ایک پہلو سے عبد بننے سے خدا نصیب نہیں ہوگا۔ اگلا قدم عبد بننے کا بھی لازماً اٹھانا ہوگا یعنی عبادت کی طرف جب آپ آگے قدم بڑھائیں گے تو پھر صحیح معنوں میں آپ خدا کے سچے بندے بن سکیں گے اور پھر آپ کو لقائے باری تعالیٰ نصیب ہوگی۔

پھر حضرت قتادہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہاری امت پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں اور اپنے حضور یہ عہد باندھا ہے کہ جو کوئی بھی انہیں ان کے وقت پر ادا کرتے ہوئے اور ان پر مداومت اختیار کرتے ہوئے (یعنی یہ نہیں کہ کبھی پڑھ لیں اور کبھی نہ

پڑھیں، مستقل ہو جائے۔ ہمیشہ پڑھنے لگے) میرے پاس آئے گا۔ (یعنی حاضر ہوگا قیامت کے دن اس حالت میں کہ وہ نمازوں کے رستے آیا ہو)۔ فرمایا میں نے یہ عہد باندھا ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں گا اور جوان کی حفاظت نہیں کرے گا۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی وعدہ نہیں'' یہ تو نہیں فرمایا کہ میں لازماً اسے جہنم میں ڈالوں گا لیکن فرمایا کہ میں عہد کے معاملے میں اس سے آزاد ہوں۔ پھر وہ میرے حضور کوئی وعدہ نہیں پیش کر سکتا کہ اے خدا! تو نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے جنت میں ڈالے گا۔ پس میں تو اس راہ سے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے جنت عطا کرے (ابوداؤد کتاب الصلوۃ حدیث نمبر: ۴۳۰)

پنج وقتہ نمازوں کو کتنی اہمیت ہے اور افسوس ہے کہ ابھی تک سو فیصدی جماعت کے متعلق میں یقین اور اطمینان سے نہیں کہہ سکتا کہ سارے پنج وقتہ نماز پر قائم ہو چکے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس حدیث قدسی میں دو باتیں بیان فرمائیں ہیں۔ ایک نماز کا قائم کرنا اسے اپنی تمام لوازم اور شرائط کے ساتھ کھڑا کرنا اور دوسرا ہے پھر اس کی حفاظت کرنا۔ ضائع نہ ہونے دینا۔ کبھی دین کے غلبے ہوتے ہیں، کبھی دوسرے کام ہوتے ہیں، کبھی دنیا کے پھندوں میں انسان پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ جو حفاظت کرنے والا ہے وہ جس طرح شیرنی اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے وہ نماز کو کسی پہلو سے بھی آنچ نہیں آنے دیتا ہر خطرہ سے اس کو بچاتا ہے

پس اگر جماعت احمدیہ اس طریق کو اختیار کرے تو یہ وہ طریق ہے جس طریق سے خدا تعالیٰ کی لقاء نصیب ہوگی ورنہ تصوراتی عشق سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔

پھر حضرت عبداللہ بن الشخیرؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔

قال اتیت رسول اللہ ﷺ وھو یصلی ولجوفه ازیر کازیر المرجل من البکاء (بخاری کتاب الصوم حدیث نمبر: ۱۸۸۴)

کہ انہوں نے بتایا کہ میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نماز ادا کر رہے تھے اور رونے کی وجہ سے آپ کے سینے سے ہنڈیا کے ابلنے کی طرح آواز آرہی تھی۔

پس صرف نماز کا سوال نہیں ہے۔ نماز کس طرح پڑھی جاتی ہے، کس کیفیت کے ساتھ پڑھی

جاتی ہے یہ بھی سمجھنا ضروری ہے۔ پس پہلے نمازوں کے لئے وہ ہنڈیا تو بنائیں جس ہنڈیا سے ابلنے کی آواز آئے گی اگر نماز کا بدن ہی قائم نہ ہوا گر پنج وقتہ نمازوں کی حفاظت نہ ہو تو وہ کون سی ہنڈیا ہے جس سے ابلنے کی آواز آئے گی۔ پس آپ کا سینہ تب اس ہنڈیا کی طرح بنے گا جب ہنڈیا موجود ہوگی اور وہ نمازوں کی ہنڈیا ہے اگر نہیں ہے تو اس کو حاصل کریں اس کے بغیر تو روحانیت کے جوش مارنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ روحانیت کہاں بٹھائیں گے آپ؟ آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ آپؐ نمازوں کے برتن میں اپنی محبت کو خدا تعالیٰ کے حضور پیش کرتے تھے اور نمازوں میں لپٹی ہوئی آپؐ کی روح خدا کے حضور جوش مارتی تھی اور واقعتہً دیکھنے والوں کو یوں آواز آتی تھی جیسے واقعی کوئی ہنڈیا ابل رہی ہے۔ پھر آپ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔

''حضرت مغیرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ بعض اوقات نمازوں میں رات کو اتنی دیر تک کھڑے رہا کرتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں اور پنڈلیاں تک متورم ہو جایا کرتے تھے۔ یعنی کھڑے کھڑے سوج جاتے تھے اس بارے میں آپ سے عرض کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا **افلا اکون عبدا شکورا**. (بخاری کتاب التفسیر حدیث نمبر: ۴۴۵۹) کہ کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں''۔ مطلب یہ ہے کہ کسی نے تعجب سے کہا ہوگا کہ یا رسول اکرم ﷺ آپؐ کو کیا ضرورت ہے اتنی لمبی چوڑی عبادتوں کی آپؐ کو تو خدا مل چکا ہے، آپؐ تو خدا کے ساتھ رہتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ تبھی تو مجھ پر دہرا فرض ہے کہ اس پاک ذات کا شکریہ ادا کروں۔ پس ایک عبادت ہوتی ہے حصول کے لئے، ایک ہے لقاء کے بعد اپنے محبوب کو راضی رکھنے کے لئے، ایک گریہ وزاری ہوا کرتی ہے ہجر کی گریہ وزاری، اکثر کو تو وہ بھی نصیب نہیں ہے لیکن ہجر کے بعد جب محبوب مل جاتا ہے تو اس کے حضور جو انسان بیٹھ کر روتا ہے اور اس سے پیار کی باتیں کرتا ہے، اسے اپنا رکھنے کیلئے اس کی منتیں کرتا ہے یہ وہ گریہ وزاری تھی جو آنحضرت ﷺ کو نصیب ہوئی تھی۔ پس عبد شکور بننے کا یہ مطلب ہے کہ تم ہجر کے واقف لوگ ہو تمہیں کیا پتا کہ لقاء کے رونے کیا ہوا کرتے ہیں۔ جب خدا نصیب ہو جائے تو کتنے پیار کے ساتھ اس کو اپنا بنائے رکھنا پڑتا ہے اور بار بار عرض کرنی پڑتی ہے کہ تیرا احسان ہے کہ تو مجھے نصیب ہو گیا ہے ورنہ میں کہاں اس لائق تھا۔

پھر صاحبِ لقاء کو ایک مرتبہ اور ایک مقام عطا کیا جاتا ہے جو اسے باقی بندوں سے ممتاز

کر دیا کرتا ہے۔ لقاء کے دعویدار دنیا میں بہت ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لقاء کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو پھر اگر انسان چھپانا چاہے بھی تو چھپ سکے۔ صاحب لقاء وجود میں کچھ علامتیں ظاہر ہوتی ہیں جو خدا سے تعلق کی علامتیں ہیں۔ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے فرمایا اور ابو ہریرہؓ کی یہ روایت ہے۔

''آپؐ فرماتے ہیں خدا نے فرمایا کہ جس نے میرے ولی سے عداوت و دشمنی کی تو میں اسے جنگ کی خبر دیتا ہوں۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا ایسا مقرب ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے'' (بخاری کتاب الرقاق حدیث نمبر: ۶۰۲۱)

اب کوئی ملاں ہو تو کہے گا نعوذ باللہ من ذالک کیسی گستاخی والی بات ہے۔ خدا پاؤں بن جاتا ہے۔ لیکن وہی بات ہے جس کو وصل نصیب ہی نہ ہو اس کو کیا پتا کہ وصل کیا ہوتا ہے۔ ہجر میں بیٹھے اندھیری راتوں میں جو چاہیں آپ تصور کرتے پھریں۔ یہ تو ایک صاحب وصل کی خبر ہے۔ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ بتا رہے ہیں جن سے زیادہ خدا سے محبت کرنے والا کوئی نہیں تھا جن سے زیادہ خدا کے ادب اور احترام کا کوئی تصور بھی نہیں رکھ سکتا۔ آپؐ کو خدا نے خود بتایا کہ میرا بندہ جب مجھ سے پیار کرنے لگتا ہے تو مجھے دیکھو کہ میں پھر اس کے مقابل پر کتنا جھکتا ہوں یعنی عجز کا مضمون اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ بندہ جب عاجزی میں کمال اختیار کرتا ہے تو پھر محبوب آقا اپنے آسمانی آقا کی عاجزی بھی تو دیکھو کہ وہ کیا رنگ اختیار فرماتا ہے۔ کہتا ہے

''میں اس سے محبت کرتا ہوں میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو ضرور اسے عطا کرتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ کا طلب گار ہو تو ضرور اسے اپنی پناہ میں لے لیتا ہوں۔

پس یہ ہے لقائے باری تعالیٰ جو ہم نے قرآن اور حضرت محمد مصطفی ﷺ سے سیکھی اور جن کا عرفان پا کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان باریک راہوں کو خوب کھول کر ہمارے سامنے روشن کر دیا ہے۔ پس یہ لقاء ہے جس کا ہمیں طالب ہو جانا چاہئے اور یہ رمضان اگر خدانخواستہ

ضائع چلا گیا ہو تو باقی دنوں میں بھی کوشش کرتے رہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض دفعہ بعض علاقوں میں ہیرے جواہرات یا سونے کی خبر ملتی ہے اور وہ ایک ہی لمحہ ہوا کرتا ہے جو انسان کو امیر بنا دیتا ہے لیکن اس لمحہ کی تلاش میں کتنے لاکھوں کروڑوں لمحے انسان کو صرف کرنے پڑتے ہیں پس لیلۃ القدر کا ایک لمحے میں آپ کا پا جانا یہ مطلب نہیں رکھتا کہ آپ صرف اسی لمحے کو لیلۃ القدر کے حضور حاضر ہونے کی کوشش کریں۔ دیکھیں جو سونے کی تلاش کرتے ہیں وہ اپنی زندگیاں گنوا دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے خوش نصیب وہ ہوتے ہیں جنہیں وہ جگہ مل جاتی ہے۔ جہاں سونے کی کانیں ہوتی ہیں جو ہیرے، جواہر کی تلاش میں رہتے ہیں وہ دن رات سرگرداں رہتے ہیں۔ مہینوں، سالوں اپنے صرف کر دیتے ہیں بعض اپنی ساری دولتیں اس راہ میں لٹا دیتے ہیں پھر بعض کو خوش نصیبی سے وہ ہیرا میسر بھی آ جاتا ہے جو ان کی دنیا بھی بنا دیتا ہے اور اگر وہ نیکی کی طرف مائل ہوں تو عاقبت بھی بنا سکتا ہے۔ **خدا ایک لعل بے بہا ہے اس کے لئے کم سے کم وہ رجحان تو پیدا کریں جو دنیا والا دنیا کے ہیروں کی محبت میں پیدا کرتا ہے۔** اگر خدانخواستہ یہ رمضان بھی خالی گزر جائے تو باقی سارا سال پڑا ہوا ہے۔

اگلی لیلۃ القدر کی تیاری شروع کر دیں اس جمعہ کو وداع نہ کہیں بلکہ اس نے جو پاک سبق آپ کو سکھائے ہیں ان سے چمٹ کر بیٹھ رہیں۔ اپنی عبادتوں کے معیار کو بلند کریں اور خدا سے ہمیشہ یہ ملتجی رہیں اور متمنی رہیں اور اس کے در سے امید رکھیں کہ آج نہیں تو کل اس دنیا میں آنکھیں بند کرنے سے پہلے وہ آپ کو لقاء عطا فرما دے گا۔ **احمدی صاحب لقاء بن جائیں تو ساری دنیا ان کے قدموں کی ٹھوکروں میں پڑی ہوگی۔ تمام دنیا کے وہ موتی بن جائیں گے۔ تمام دنیا کے وہ داتا ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ خدا کے ہوں گے اور خدا کی آواز سے بولنے والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عبادت کا یہ معراج عطا فرمائے۔** (آمین)